# اکیلے پھرو اب ہوا کی طرح

اتوار کا پورا دن ایک صوفی اور ایک حکمران کے درمیان بیت گیا..... پروفیسر احمد رفیق اختر کی خدمت میں لیکن سارا وقت لوگ صدر پرویز مشرف کے بارے میں سوال کرتے رہے۔ ایک تھکا دینے والی گفتگو۔ آپ کو اپنا جواب بار بار دہرانا پڑتا ہے: ان کا عہد بیت گیا لیکن اب لوگوں کو مطمئن کرنا سہل نہیں..... سوال کے پیٹ میں سے وہ ایک اور سوال برآمد کرتے ہیں اور پھر ایک اور سوال..... شب گوجر خاں سے واپس آتے ہوئے مجھے شاعر یاد آیا

اکیلے پھرو اس ہوا کی طرح
جس کے پیچھے چلے تھے
تم اتنا اونچا اڑے
کہ سنائی دکھائی نہ دیتے تھے
تم اتنا اونچے اڑے
کہ پہاڑوں کو ٹیلے سمجھنے لگے
اکیلے پھرو اس ہوا کی طرح
جس کے پیچھے چلے تھے

تین برس ہوتے ہیں..... پروفیسر احمد رفیق اختر کو "اہل حکم" نے مدعو کیا۔ صاف اور کھرے الفاظ میں جو درویش کا شیوہ ہے، انہوں نے کہا: تم اپنی جنگ کس طرح لڑو اور جیتو گے، تمہارے پیچھے تو روحانی توثیق ہی کارفرما نہیں۔ غزنی کا محمود، ہندوستان کے بے پناہ لشکروں سے رزم آرا ہونے سے پہلے ہجویر کے محلے میں گیا تھا۔ اپنے عہد کے عظیم ترین سکالر اور صوفی حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ سے مشورہ اور دعا طلب کرنے..... شہاب الدین غوری نے دہلی پر یلغار سے پہلے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو عرضداشت بھیجی تھی: اگر آپ اجازت دیں تو آتا ہوں ورنہ اپنا ارادہ ملتوی کرتا ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اختتام پر افسر لوگ بے تابانہ اٹھے اور پانچ منٹ تک تائید میں تالیاں بجاتے رہے۔ حسن اتفاق سے اس تقریر کی وڈیو ٹیپ موجود ہے..... پھر ان میں سے بعض حاضر ہوتے رہے۔ صوفی کو سیاست سے کوئی غرض نہیں۔ فقط اصولی، عملی اور اخلاقی حوالہ۔ وہ بات جو دل سے نکلتی اور دلوں میں جا ٹھہرتی ہے۔

دانا حکمران وہ ہوتے ہیں جو اہل علم سے رجوع کرتے ہیں۔ قرآن قرار دیتا ہے کہ جب کوئی پیچیدگی آن پڑے اور جب کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو تو "راسخون فی العلم" سے رجوع کیا کرو..... وہ لوگ جن کی علمی اور اخلاقی شخصیت شک و شبہ سے بالاتر ہو..... اور اللہ کے آخری رسولؐ نے یہ کہا تھا "علیکم مجالس بالابرار" تمہیں نیکوکاروں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنا ہے اور نیکوکار وہی ہوتا ہے جو صاحب ادراک ہی نہیں صاحب علم بھی ہو۔

صدیاں گزر گئی ہیں جب اس صاحب جلال بلبن نے ملتان سے دہلی کا قصد کیا۔ شیر شاہ سوری کی پشاور سے کلکتہ تک جا پہنچنے والی شاہراہ بہت بعد کو وجود میں آئی، تب دیپال پور کا راستہ تھا۔ یہاں اپنے عہد میں علم کی سلطنت کا فرمانروا فرش خاک پہ بیٹھا انسانوں کی زندگیاں سنوارتا تھا۔ فریدالدین شکر گنجؒ جن کے ہاتھ پر جاٹ، گوجر اور ان سے زیادہ راجپوت قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ لشکر شہر کے قریب پہنچا تو عساکر بضد ہوئے کہ آستانے پر حاضری دیں گے۔ اس آدمی نے جسے آنے والے زمانوں میں زندہ رہنا تھا، خانقاہ سے باہر نکل کر خیر مقدم کیا اور اولین صف کے سوار مصافحے کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب رہے لیکن کتنی دیر..... حد نظر تک سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ درویش نے کرتا اتارا اور لٹکا دیا..... وہ اسے چھوتے ہوئے گزر گئے..... انہوں نے رفعتوں کو چھو لیا تو یہ کرامت نہیں تھی۔ لشکروں اور حکومتوں کا ایک رخ ہونا چاہئے..... سوچی سمجھی ہوئی سمت..... صدر پرویز مشرف کے لشکر کی سمت انہوں نے نہیں، کسی اور نے مقرر کی۔ قبائلی علاقے پر بمباری کوئی اور کرتا اور ذمہ داری پاک فوج اٹھاتی رہی۔ حکمرانوں کا کام خلق خدا کو عدل اور امن عطا کرنا ہوتا ہے۔ پسماندہ، مظلوم اور کمزور کی نگہداشت..... جب ایسا نہ کیا جائے تو اختتام ایک آزردہ کرنے اور توڑ دینے والی ناکامی پر ہوتا ہے۔ حکمران تو خیر چلے جاتے ہیں لیکن وہ قوم بھی مخمصے میں گرفتار ہوتی ہے، جو جبر کو گوارا کرے اور خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دے..... وہ وقت آ پہنچا، یہ تدبیر کا وقت ہے لیکن دعا کا بھی..... اللہ دعائیں قبول کرتا ہے اور کاوشیں غارت نہیں کرتا۔

امریکیوں کی تجاویز سادہ اور سہل ہیں۔ نواز شریف کو تیسری بار وزیراعظم بننے کی اجازت دی جائے..... ضمنی الیکشن میں ان کے کاغذات قبول کرائے جائیں۔ زرداری یا ان کا نمائندہ وزیراعظم بن جائے..... جج بحال کر دیئے جائیں لیکن جناب پرویز مشرف کو پانچ سال کیلئے صدر مان لیا جائے۔ وہ دستور کی دفعہ 58 ٹوبی سے دستبردار ہو جائیں اور افواج کے سربراہوں کی تقرری سے بھی۔ ان کے بیشتر اقدامات کی توثیق کر دی جائے۔ وہ دخل اندازی نہ کریں گے اور گالف کھیلا کریں گے..... کتنا آسان نسخہ مگر یہ قابل عمل نہیں..... امریکیوں نے ارادہ کرنے میں بہت تاخیر کر دی، پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا۔

آج قومی اسمبلی کا اجلاس ہوگا۔ شاید بیشتر کو اندازہ ہی نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا اور نفسیاتی طور پر فضا کس تیزی سے بدل جائے گی۔ ایسا ہوگا جیسے برتن کے نیچے آگ جلا دی جائے اور پانی بخارات بن کر اڑنے لگے..... حکومت ایک رعب اور ہیبت کا نام ہوتا ہے، وہ کیسے برقرار رہے گی..... زلزلے کی زد میں آئی ہوئی عظیم الشان عمارت کی بنیادیں کانپتی ہیں مگر بنیادوں کو کون دیکھتا ہے..... اول اس کے کنگرے گرتے ہیں، اوپر کی منزلیں..... لگتا ہے کہ وہ جھٹکا سہہ گئی لیکن سہہ نہیں سکتی..... دراڑیں پڑتی ہیں اور بالآخر زمین بوس۔ سرحد اور پنجاب تو الگ بلوچستان میں کیا ہوا، جہاں قاف لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی..... حالات اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور پانی اپنے رخ پر بہتا ہے۔ 1974ء میں پنجاب کے گورنر کو یہ بات یاد نہ رہی لیکن چولستان میں، میجر عارف کو معلوم تھی' چنانچہ انہوں نے سیلاب کے ریلے کو دریائے گھاگھرا کے قدیم ویران پاٹ پر ڈال دیا۔ رحیم یار خان کو بچا لیا گیا ورنہ شہر ڈوب گیا ہوتا۔ حکمران اپنے زعم میں اکثر بنیادی اصولوں کو بھول جاتے ہیں..... ہوا میں آدمی نہیں اڑ سکتا لیکن وہ اڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور رزق خاک ہوتے ہیں..... رزق خاک تو صوفی بھی ہوتا ہے مگر اور طرح سے۔

موت کی طرف بڑھتے ہوئے ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ سبک ہوتا چلا جاتا ہے۔ مولانا روم بستر مرگ پہ تھے جب ایک عالم دین تیمارداری کو تشریف لائے۔ کہا: انشاءاللہ شفا ہوگی۔ جواب ملا: شفا آپ کو مبارک ہو ابھی کچھ دیر میں مٹی، مٹی میں اور نور نور میں مل جائے گا..... اور حکمران؟

تم اتنا اونچا اڑے
کہ سنائی دکھائی نہ دیتے تھے
اکیلے پھرو اس ہوا کی طرح
جس کے پیچھے چلے تھے

# زندگی بھر کی محبت کا صلہ

اللہ کی اس کائنات میں آدمی کس قدر تنہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پروردگار کے سوا کوئی اس کا راز دان نہیں۔ ادھوری محبتیں اور ان سے آس امید؟ امید تو صرف اللہ سے ہو سکتی ہے۔

خلیل ملک چلے گئے۔ سبھی کو چلے جانا ہے مگر اس طرح نہ جاتے۔ خرابی نہیں، کبھی خوبی قاتل ہو جاتی ہے۔ خاتون، جس سے اس نے خاموشی سے شادی کر لی تھی، ذہنی مریض ہو گئی۔ ملک نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں جان ہار گیا۔

یادیں ہجوم کرتی چلی آتی ہیں کہ انتالیس برس کی داستان ہے۔ روزنامہ کوہستان کے مدیر عبدالوحید خان نے ایک دن خوش چہرہ، خوش لباس آدمی سے تعارف کرایا۔ گریجویٹ ہیں، نوکریاں ختم ہو چکیں اور انہوں نے پروف ریڈر کا منصب گوارا کر لیا، ذہانت، تعلیم، عرق ریزی، ادراک ہر اعتبار سے وہ بہتر تھا۔ ایک دن کیلئے بھی میں نے اسے پروف ریڈنگ کا کام نہیں سونپا۔ عالی رضوی کی قبر کو اللہ نور سے بھر دے، جلد ہی انہوں نے اسے تاک کر دیا۔ شب کو نڈھال ہو کر لوٹتے۔ ایسے دن بھی آئے کہ کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اسلامیہ کالج کے ہوسٹل کا دروازہ کھلنے تک گول باغ میں پڑے رہتے۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی عبدالحمید کے کمرے میں کچھ دیر کو سو رہتے۔ وہ لوٹ کر آتا تو روزنامہ کوہستان کی کہنہ عمارت کو پہنچتے، جس کے عقب میں علامہ اقبال کا پرانا گھر تھا، اب وہ ایک قومی یادگار ہے، بھلا دی گئی یادگار۔

ہر چیز بھلا دی جاتی ہے۔ سب کچھ جو خالص اور خوبصورت ہے، نازک اور نفیس ہے، خام اور بھدا بن جاتا ہے، ٹوٹ کے گر پڑتا ہے اور خراب و خستہ ہو جاتا ہے۔

ع: اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا

وہ صبحیں اور وہ شامیں، لارنس گارڈن اور اگلے زمانوں کے خواب۔ پست و پامال اخبارات کے تنخواہوں سے محروم اخبار نویس۔ پانچ برس ہوتے ہیں، سعید صفدر بھی چلے گئے۔ سب چلے جاتے ہیں اور یادوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔

ہر موضوع پر لکھا جا سکتا ہے لیکن مرنے والوں کی یادوں کو سمیٹنا مشکل ہے۔

ایک المناک احساس تنہائی، معلوم نہیں اور اس میں اتنی شدت کہاں سے آ گئی تھی۔ ایک آسودہ رفاقت کی آرزو میں اس نے کتنی خاک چھانی اور مراد بر نہ آ سکی۔ تیرہ برس ہوتے ہیں، ایک دن اچانک اس نے کہا: کسی نے قرار لوٹ لیا ہے، میں تو گوجر خان میں ایک گرامی قدر استاد کے پاس جاتا ہوں، میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا: پاگل ہوئے ہو، ایسی اچھی عائلی زندگی اور اس پر یہ دیوانگی۔ اس نے کہا: میں ٹوٹ چکا ہوں اور میری بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اہلیہ نے اجازت ارزاں کر دی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اسے بھی میں نے اسی بے قراری سے چاہا تھا۔ پروفیسر احمد رفیق اختر سے یہ پہلی ملاقات تھی، پروفیسر نے اور کہا: کوئی مشکل ایسی نہیں، اللہ جسے ٹال نہ سکے۔ انہوں نے دعائیں تعلیم کیں اور ملک متواتر پڑھتا رہا۔ وہ بے تاب آرزو بھاپ بن کر اڑ گئی لیکن تابہ کے؟ جب لت پلٹ کر حملہ کرتی ہے۔

محبت میں ملک ایک نچھاور ہو جانے والا آدمی تھا۔ کس کو اولاد سے محبت نہیں ہوتی مگر اسے بچوں سے ایسا پیار تھا کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ پانی کی طرح وہ بہہ جاتا، بہت محنتی، بہت پڑھا لکھا، انگریزی اظہار پر دسترس اگر وہ محض ایک آزاد کالم نگار ہوتا تو نمایاں ترین لوگوں میں بھی نمایاں ہوتا۔ مطالعے کا خوگر، سیاست کے داؤ پیچ کا پورا فہم، کمال کا طالب علم۔ ایک اشاعتی ادارے کے سربراہ نے پیشکش کی۔ ملک نے انکسار کا اظہار کیا تو اس نے کہا: ملک صاحب آپ اپنے جج نہیں، آپ کی صلاحیت کو ہم جانتے ہیں، مگر اخبار کی آمدن پر گزارا کیسے ہوتا۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم بچے اور ایک کے بعد دوسرا بیرون ملک۔ ایک آسودہ زندگی کی آرزو میں عرب کے صحراؤں کی خاک چھانی اور ہر طرح کی بے پناہ ریاضت کی۔ لیکن 1991ء کی جنگ خلیج نے اس کی بسی بسائی دنیا اجاڑ دی۔ اخبار نویس دوست محسوس کرتے کہ حکمرانوں کے ساتھ کام کرنے کا چسکا اسے برباد کئے دیتا ہے۔ بات اتنی سادہ سی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست دانوں نے اسے برباد کیا۔ اخبار نویس اور سیاستدان کی دوستی سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں اور کوئی نبھانے کی کوشش کرے تو وہ سموچی زندگی نگل جاتے ہیں۔

بیوی بچوں پر جان چھڑکنے والے آدمی کے احساس تنہائی کو کوئی نہ سمجھ سکا۔ شام ہوتی تو وہ اصرار کرتا کہ کچھ تھوڑا سا وقت اکٹھے بتایا جائے۔ مجلس نصف شب تک تمام نہ ہوتی بالآخر میں نے گریز اختیار کیا۔ دل میں شکوہ تھا مگر شکوہ وہ کرتا نہیں تھا۔ پروفیسر احمد رفیق اختر مجھ سے کہتے: اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، ایک آدھ بار انہوں نے اصرار کے ساتھ کہا: وہ فریب خوردہ ہے مگر اس کی روح میلی نہیں۔ گاہے ماہے اس کا فون آتا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ادنیٰ عبارت یا معمولی جملہ اسے پسند آیا ہو۔ کوئی عام سی کتاب کوئی عام تحریر کبھی نہیں اور اس شان کے آدمی کو شوکت عزیز کے ساتھ کام کرنا پڑا۔ عمران خاں ڈیرہ غازی خاں جیل میں تھے۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے میں بھنایا ہوا نکلا تو فون کی گھنٹی بجی۔ کہا، "چودھریوں نے وزیراعظم کو ناک آؤٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، کیا میری خاطر حرف اعتراض لکھ سکتے ہو"۔ میں نے کہا "ملک صاحب، شوکت عزیز کیلئے؟ اپنے آپ پر رحم کیجئے۔ مشکل وقت آیا تو وہ آپ کو پہچانیں گے نہیں"۔

آج دل پر زخم ہے۔ وہ ربط استوار رکھتا تھا۔ کچھ بھی نہ کر پاتا مگر اس کی روداد سن سکتا، درد بٹا سکتا تھا۔ غصہ مجھے اس پر بہت تھا۔ ایسا فطین، ایسا ریاضت کیش، اتنا مرتب آدمی اور ان ریاکاروں کا ہم نشین۔ سعید صفدر چلے گئے۔ ملک صاحب چلے گئے اور زخم باقی رہ گئے۔ سوچا: اللہ کی اس کائنات میں آدمی کس قدر تنہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس کا کوئی راز داں نہیں۔ ادھوری محبتیں اور ان سے ایسی آس؟ آدمی کو آدمی کیا دے سکتا ہے۔ اس ناتمام کائنات میں سچی محبت اور کمال آسائش کی آرزو کیسی خام آرزو ہے۔ پروفیسر صاحب آزردہ تھے۔ کہا: وہ اچھا آدمی تھا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے گا کہ وہ بے نوا مارا گیا۔ ترک کر دیتا تو بچ رہتا لیکن ترک وہ کر نہ سکتا تھا۔ خامی نہیں، میرے دوست کی خوبی اس کی قاتل ہو گئی اور اب دعائے مغفرت کے سوا کیا؟

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

تو نکتہ یہ ہے کہ عدل کائنات کی فطرت ہے اور زندگی اس کے بغیر جمی جڑی نہ رہے گی، منتشر ہو جائے گی۔
پروفیسر احمد رفیق نے بات کو ایک نادر مثال سے واضح کیا۔ ایک منفرد تحقیقی کاوش کا حوالہ دیا۔ بندروں کے ایک ہجوم میں سائنس دان نے ایک بندر کو کھانے کے لئے کیلا دیا، بھلا چنگا، پھر دوسرے بندر کو چھوٹا سا گلا سڑا..... دوسرے بندر نے اس پر احتجاج کیا، ناراضی سے وہ اچھلا، کودا اور منہ بنایا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ کہ کچھ دیر میں، تمام بندر احتجاج میں شریک ہو گئے۔ وہ چیخ رہے تھے۔
عدل کے موضوع پر یہ اسلام آباد میں ایک لیکچر تھا۔ چار پانچ سو منتخب افراد۔ بدانتظامی سے تقریب بگڑ گئی ہوتی مگر وہ سلیقہ مند استاد اپنے مزاج کو کسی حال میں پریشان ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی اجتماع کو۔ دو برس ہوتے ہیں، تحریک انصاف کی دسویں سالگرہ تھی۔ قاضی حسین احمد تھے اور خود عمران خاں۔ انہیں مشورہ دیا گیا کہ پروفیسر احمد رفیق اختر کو بلا لیجئے۔
عمران خاں کو ظاہر ہے کہ آخر میں خطاب کرنا تھا۔ قاضی حسین احمد مہمان خصوصی تھے۔ پروفیسر صاحب کو بلایا گیا کہ سیاست کے اسلامی تصور پر گفتگو کریں۔ بلا کی گرمی اور حبس لیکن پھر گفتگو کا آغاز ہوا تو چند لمحوں کے بعد مجمع، مقرر کی مٹھی میں تھا۔ عجیب آدمی۔ وہ اپنی آواز بلند نہیں کرتے۔ جذبات کو آواز نہیں دیتے۔ روایتی مقررین کا کوئی ایک وصف ہی نہیں مگر خیال کی ندرت اور لہجے کی تاثیر ایسی کہ میر صاحب یاد آتے ہیں۔

رات ہم بھی تری محفل میں کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

قاضی حسین احمد، سیاستدانوں میں شاید سب سے اچھے مقرر ہیں۔ زبان و بیان پہ گرفت، آواز میں جوش و ولولہ، فارسی اور عربی کا اثاثہ، عمدہ یادداشت مگر ان سے غلطی ہوئی کہ پروفیسر صاحب کے بعد انہی کے موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی۔ نبھا گئے مگر اس طرح کہ گویا تنی ہوئی رسی پر چل رہے ہوں۔ بعد ازاں عمران خاں نے مجھ سے کہا: پروفیسر صاحب نے لوگوں کو مسحور کر دیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ انہوں نے گفتگو کی۔ لیکن سامعین سے پوچھا گیا تو ان کا کہنا یہ تھا کہ تشنگی رہ گئی، کاش وہ اتنا ہی وقت مزید عنایت کرتے۔ تعجب خیز یہ ہے کہ چونکہ انگریزی ادبیات کے استاد ہیں؛ لہٰذا بہت کچھ بدیسی زبان، پھر ادق مضامین اور وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے سامعین بلند تر ذہنی سطح کے لوگ ہیں۔ اس کے باوجود مجمع لشکر کی طرح آراستہ رہتا ہے۔ ایبٹ آباد میں ایک بار نو گھنٹے تک خطاب کیا۔ نماز اور کھانے کے سوا کوئی وقفہ نہ تھا۔ صوفی کے لہجے کا جمال۔ ایک بار پھر عمران خاں ان سے ملنے گئے۔ شب کے سوا گیارہ بجے تھے۔ انہوں نے فلسفہ ارتقا (THEORYOFEVOLUTION) پر سوال کیا۔ سوال سے سوال پھوٹتا رہا۔ آلتی پالتی مارے، فرش پر کپتان ان کے سامنے بیٹھا رہا اور چراغ سے چراغ جلتا رہا۔ سحر کے پونے چار بجے تھے، جب پروفیسر صاحب نے ان سے کہا: خان صاحب اب فجر کی نماز آپ اپنے گھر پہ جا پڑھئے، میں گھنٹہ بھر سو لوں کہ پھر ایک طویل دن کے معمولات ہیں۔
پروفیسر صاحب نے کہا: عدل فطرت کائنات ہے اور فطرت ذات بھی۔ یہ خارجی وصف نہیں جو کوشش سے حاصل کیا جائے۔ یہ داخلی اور جبلی ہے۔ آدم زاد ہی نہیں، ہر زندہ مخلوق کے اندر عدل کا شعور کارفرما ہے..... اور اسی ضمن میں بندروں کا حوالہ دیا۔ کہا: عدل قانون ہے مگر قانون سے بالا بھی۔ بکری کا ایک بچہ مسافر چرواہے کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ تین برس کے بعد لوٹ کر آیا تو مطالبہ کیا۔ چرواہے نے کہا: تین برس میں کتنا سرمایہ اس پہ طعن صرف ہو گیا، اب امانت سونپنے والے کا کوئی حق نہیں۔ منصف نے اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا اور لعن کی کہ وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ چرواہے نے اس پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کی عدالت میں اپیل کی۔ انہوں نے سنا اور چرواہے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ قرآن کریم ان کی تحسین کرتا اور یہ کہتا ہے "ففھمنا سلیمان" (ہم نے سلیمانؑ کو فہم عطا کیا تھا)۔
پھر انہوں نے جنگ حنین کا تذکرہ کیا، جہاں دو فریقوں نے رسول اللہ ﷺ پر مال غنیمت کی تقسیم پہ اعتراض کیا۔ بدقسمت ذوی الخویسرہ، جس نے عالی مرتبت سے کہا "محمدؐ انصاف کرو"۔ فرط رنج سے اللہ کے آخری رسولؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمایا: اگر محمدؐ انصاف نہ کرے گا تو کون کرے گا؟ پھر انصار مدینہ، ان میں چہ میگوئیاں تھیں کہ عالی جنابؐ کی رفاقت میں کیسی عظیم الشان قربانیاں انہوں نے پیش کیں۔ سارے عرب کے خلاف آپؐ کی حفاظت کی اور جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر جنگ کے میدانوں میں اترتے رہے لیکن آج ریوڑ کے ریوڑ نو مسلموں کو دے دیئے گئے اور ان کے حصے میں کم ہی آیا۔ آپؐ نے انہیں جمع کیا اور وہ تاریخی الفاظ کہے، گردش لیل و نہار جنہیں کبھی دھندلا نہ سکے گی۔ انصار کی قربانیوں کا اعتراف فرمایا۔ ان احسانات کا حوالہ دیا جو جتلائے جا سکتے تھے، مثلاً یہ کہ مدینہ کے بغض و عناد کی آگ میں جلتے قبائل ایک دوسرے کو کاٹ پھینکتے، اگر آپ وہاں تشریف نہ لے جاتے، انہیں بھائی بھائی نہ بنا دیا ہوتا اور انس و الفت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اللہ کی دہلیز تک لے گئے۔ حوالہ اس انداز سے دیا کہ جواباً یہ بھی کہا جا سکتا تھا مگر ارشاد یہ کیا: "کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ دوسرے دنیا کا مال لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے ساتھ لے جاؤ"۔ روتے روتے انصار کے نوجوانوں اور بوڑھوں کی داڑھیاں بھیگ گئیں کہ کائنات کی عظیم ترین نعمت کی طرف ان کا دھیان کیوں نہ گیا۔ اپنے شہر کو وہ شاداں لوٹے اور تمام عمر دوسروں کو اس مبارک اور فیصلہ کن دن کی داستان سناتے رہے۔
ابھی ابھی یہ سطور لکھتے ہوئے، پروفیسر صاحب سے میں نے سوال کیا: آپ کا مرکزی نکتہ کیا ہے۔ کہا: تمام اعلیٰ اخلاقی اور روحانی صفات کا محور ایک ہے..... ایمان..... آدمی ٹریفک رولز بنا سکتا ہے اور مکانوں کے نقشے منظور کرنے کے قوانین مگر اخلاقی اصولوں کا سرچشمہ صرف ایک ہے۔ انسانوں کا پروردگار۔ اس لئے تمام اخلاقی قوانین مذاہب کے عطا کردہ ہیں۔ صداقت شعاری، دیانت، صلہ رحمی، ایثار سبھی کچھ۔ حمورابی کو قدیم ترین قانون ساز کہا جاتا ہے۔ 1650 قبل مسیح میں اس نے پتھروں پر جو قوانین کندہ کرائے تھے، وہ بیسویں صدی میں دریافت ہوئے، اکتیس صدیوں کے بعد مگر تعجب بعض قوانین مثلاً قصاص کے قواعد، حرف بحرف قرآن کریم کی بعض آیات کا ترجمہ ہیں۔ نتیجہ؟ یہ کہ وہ کسی پیمبر کی تعلیمات ہیں کہ تاریخ میں تسلسل فقط پیمبروں کی تعلیمات میں رہا
۔
آیات کا حوالہ دیا "اے ایمان والو، انصاف کی خاطر مضبوطی سے جمے رہو اور اللہ کی خاطر گواہی دو؛ اگرچہ یہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے ماں باپ یا رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ یہ شہادت امیروں کے خلاف ہے یا غریبوں کے"۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں سے تمہارا تعصب تمہیں انصاف سے روک دے کیونکہ انصاف نیکی کے بہت قریب ہے "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا کے لئے نیکی اختیار کرو اور انصاف کے ساتھ گواہی دو، خدا تمہیں انصاف اور خیر خواہی کا حکم دیتا ہے"۔
کہا: عدل زمان و مکان کے اعتبار سے تبدیل ہوتا ہے، یہ جامد نہیں۔ عدل نصیب نہ ہو تو معاشرے میں بخل، جنون، غیب، حسد، کینہ اور بغض جنم لیتا ہے۔ چنانچہ بنیادی نکتہ وہی کہ عدل کائنات کی فطرت ہے۔ زندگی اس کے بغیر جمی جڑی نہ رہے گی، بکھر جائے گی۔
خلق خدا کو انہوں نے خوشخبری دی کہ وہ دن دور نہیں، جب پاکستان میں عدل قائم ہو گا کہ مستقل مزاجی سے کی جانے والی کسی قوم کی کاوش کبھی برباد نہیں ہوتی۔ یہ خوشخبری اور لوگ بھی سناتے ہیں مگر صوفی کے لہجے کا یقین اور جمال لوگوں کو جیسے قرار سا آ گیا۔

# پروفیسر احمد رفیق اختر کا نظریہ ترجیح

کہتے ہیں اس عالم میں انسان کی سب سے بڑی مونس اور غم خوار "یقین" کی طاقت ہے۔ صوفی اور درویش اس سے مالا مال ہوتے ہیں۔ چاروں طرف چھایا مایوسی کا گھٹاٹوپ اندھیرا بھی انہیں متزلزل نہیں کر پاتا۔ وہ اسی سکون کے ساتھ یقین کی شمع جلاتے اور شکستہ دلوں کو نئی قوت اور طمانیت بخشتے ہیں۔

گزشتہ اتوار کی شام پر شکوہ ایوان اقبال کی سیڑھیاں چڑھتے میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا پروفیسر احمد رفیق اختر سیاست دانوں کی بے عملی اور دور خی سے بیزار نوجوانوں میں امید کی جوت جگا پائیں گے؟ پروفیسر موصوف کا لیکچر سننے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ سچ تو یہ کہ گوجر خان کے اس گوشہ نشین استاد کے بارے میں بیشتر لوگوں کی طرح میری بھی معلومات خاصی محدود تھیں۔ ممتاز مفتی نے اپنی کتاب "الکھ نگری" میں لکھا تھا کہ پروفیسر رفیق اختر نے انہیں قرآن اور اسلام کے حوالے سے مضامین لکھنے پر مائل کیا' جو بعد میں 'تلاش' کے نام سے شائع ہوئے۔ پروفیسر صاحب پبلسٹی کے شائق ہیں نہ ہی انہیں میڈیا میں آنے سے کوئی دلچسپی رہی۔ ایسے میں چند اخبار نویس ان کا تذکرہ نہ کرتے تو شاید ہم جیسے ان کے نام سے آشنا بھی نہ ہو پاتے۔ ایک آدھ بار کسی بک شاپ پر کتابوں کی ورق گردانی کرتے پروفیسر صاحب کی تصانیف بھی دیکھنے کو ملیں' پہلی نظر میں لگا کہ واصف علی واصف کی طرح کوئی انشا پرداز ہی ہے۔ چند ماہ قبل پروفیسر کے بعض مداحین سے تفصیلی مکالمہ ہوا تو اپنی بے خبری پر تاسف ہوا۔ ایوان اقبال میں ان کے سالانہ لیکچر کا علم ہوا تو ہم نے اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسلام آباد کے فسوں ساز کالم کار نے لکھا تھا کہ پروفیسر احمد رفیق اختر ہزاروں کے مجمع کو ٹرانس میں لے لیتے ہیں اور گھنٹوں کے خطاب میں کوئی پہلو بھی نہیں بدل پاتا۔ ایوان اقبال کے کھچا کھچ بھرے آڈیٹوریم میں ویسا ہی منظر دیکھنے میں آیا۔ پانچ بجے سہ پہر کو شروع ہونے والا لیکچر سات بجے تک چلا۔ نماز مغرب کے وقفے کے بعد سوال جواب کا سیشن شروع ہوا جو دو ڈھائی گھنٹے تک طول پکڑ گیا مگر حاضرین بڑے تحمل اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ جیسا کہ پہلے کہا' احمد رفیق اختر کو سننے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے مقرر ہیں' بلند آواز' مناسب زیر و بم اور پر شکوہ زبان۔ ان کی ڈکشن بڑی دلکش اور منفرد' مگر سب سے اہم اثاثہ دلیل کی قوت اور وسیع مطالعہ ہے۔ تاریخ پر ان کی نظر اور شعور بڑا گہرا ہے۔ اس لیکچر میں کاسمولوجی سے کلچر اور جین ٹیکس سے ادب تک کئی موضوعات زیر بحث رہے مگر قرآن ان کا اصل مرکز رہا۔ لیکچر کا موضوع "ترجیحات' مذہبی اور سیاسی تناظر میں" تھا۔

اگرچہ لیکچر کا پھیلاؤ ضرورت سے کچھ زیادہ ہو گیا مگر اس میں بڑے اساسی موضوعات پر سوالات اٹھائے گئے۔ پروفیسر صاحب نے بیسویں صدی میں اٹھنے والی اہم اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے بنیادی غلطی کی نشاندہی کی۔ الجزائر اور سوڈان کے انقلابیوں' مصر کے اخوان المسلمین اور پاکستان کی جماعت اسلامی کا بطور خاص ذکر آیا۔ انہوں نے اعتدال پسند روشن خیالی (modernenlightment) کا ذکر بڑے تاسف سے کرتے ہوئے کہا، "یورپ میں جان لاک' وال ٹیئر اور روسو جیسے بہترین دماغوں نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی اور مغربی معاشرے کو بیش بہا علمی سرمایہ عطا کیا' جبکہ پاکستان میں سابقہ حکومت نے اس اصطلاح کا بار بار ذکر کیا مگر اس تحریک کے لیے معاشرے کے نااہل ترین افراد کا انتخاب کیا۔" جب انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے بارے میں کہا کہ وہ تاریخ کے واحد حکمران ہیں جس نے اپنی ہی قوم کا حوصلہ پست کرتے ہوئے کہا کہ امریکی ہمیں تورا بورا بنا دیں گے۔ اس پر آڈیٹوریم پر جوش تالیوں سے گونج اٹھا۔ لیکچر کا سب سے اہم حصہ ان کا نظریہ "ترجیح" تھا۔

امت کی نشاۃ ثانیہ کا سوال صدیوں سے مسلم دنیا میں زیر بحث ہے۔ پچھلی دو تین صدیوں کے عرصہ زوال میں مختلف مفکرین اور اہل دانش سوچتے رہے کہ شکست خوردہ قوم کو کسی طرح بلندیوں کی جانب دوبارہ گامزن کیا جائے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران دنیا کے مختلف حصوں میں بڑی طاقتور اسلامی تحاریک اٹھیں مگر سب ناکام رہیں۔ دراصل ان تحریکوں کا بنیادی مقصد معاشرے کی اصلاح تھا، مگر وہ بتدریج دوسری معاملات میں الجھتی چلی گئیں۔

گزشتہ چار پانچ عشروں میں کئی علمی اور روحانی تحریکیں شروع ہوئیں۔ مصر میں شیخ عبدہ اور ان کے جلیل القدر شاگرد مفتی رشید رضا مصری نے جمال الدین افغانی کی روایت کو آگے بڑھایا، تو سید قطب اور حسن البناء کے زیر اثر اخوان تحریک بھی شروع ہوئی۔ ستر کی دہائی میں شیعہ مکتب فکر سے کئی دیو قامت لوگ اٹھے۔ ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی نے مختصر مدت میں بیش بہا کام کیا۔ لبنان میں سید موسی الصدر نے امل ملیشیا کی صورت میں تحریک برپا کی، جس سے بعد میں حزب اللہ نے جنم لیا۔ عراق کے نوجوان انقلابی رہنما مقتدا الصدر کے والد باقر الصدر نے فلسفہ فتنا اور اقتصادنا جیسی شاندار کتابیں لکھیں۔ معیشت اور بینکنگ کے موضوع پر باقر الصدر کی فکر سے انقلاب ایران کے فوراً بعد استفادہ کیا گیا۔ امام خمینی نے ولایت فقیہہ کی نئی تعبیر و تشریح سے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھی جس نے مغرب کو ہلا کے رکھ دیا۔

پاکستان میں سید مودودی پہلے ہی جماعت اسلامی کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ اگرچہ جماعت کے دستور میں فرد اور معاشرے کی اصلاح بنیادی مقصد تھا مگر پھر یہ اسلامی حکومت کے قیام کے ایسے سفر پر روانہ ہوئی کہ منزل تو ایک طرف، نشان منزل بھی اوجھل ہو گیا۔ مولانا وحید الدین خان امیر جماعت اسلامی کی حکمت عملی کو "دین کی ایک الگ تعبیر" کا نام دیتے ہیں۔ ان کی کتاب "تعبیر کی غلطی" اسی موضوع پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تحریکیں اور ایسے عبقری مفکرین اپنی تمام تر کوشش کے باوجود کیوں کامیاب نہیں ہو سکے؟ اہل علم اس کی مختلف تاویلیں کرتے رہے ہیں۔

پروفیسر احمد رفیق اختر نے تفصیل سے اسی سوال کا جواب دیا۔ وہ کہتے ہیں، "ان تحریکوں کی ترجیحات ہی غلط تھیں۔ پہلی ترجیح بندے کا خدا سے تعلق ہونا چاہیے۔ جب اللہ اول ترجیح بن جائے تو سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ تبدیلی لانے والوں کو افراد کی اصلاح کے لئے ان کا اللہ سے تعلق جوڑنا چاہیے۔ افراد تبدیل ہونے سے معاشرہ تبدیل ہو جائے گا۔ یوں خود بخود تمام نظام بدل جائیں گے۔ پھر افراد کی اصلاح کا کام کرتے وہ لمحہ بھی آ جائے گا جب اللہ تعالیٰ اقتدار کی عزت بخش دیں گے۔" پروفیسر اس ضمن میں مختلف تاریخی حوالے دے کر ثابت کرتے ہیں کہ اللہ کسی فرد سے وہ کام لے لیتا ہے جو بڑے بڑے لشکر نہیں کر سکے۔ تاہم ان کے خیال میں تمام اسلامی تحریکوں نے معاشرے کی اصلاح کے بجائے نظام کی تبدیلی کو اپنا مرکز بنایا' یوں منزل ان سے دور ہو گئی۔

نائن الیون کے بعد مسلم دنیا میں بڑی شدت سے ایک نئے لائحہ عمل اور انداز فکر اپنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ خاص کر نوجوان نسل فکری مخمصے سے دوچار ہے۔ ان کی تشفی کے لیے ایک جدید علم الکلام کی ضرورت ہے جس کی بنیاد سائنسی طرز فکر پر ہو۔ یعنی دین کی حقانیت کو جدید سائنسی اصولوں سے ثابت کرنا۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بعض اہل دانش اس طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ فرانس میں سعید رمضان' ترکی میں ہارون یحییٰ' مصر میں عمرو خالد' بھارت میں وحید الدین خان اور پاکستان میں فکر فراہی کے امین جاوید احمد غامدی ان میں قابل ذکر ہیں۔ احمد رفیق اختر اس اعتبار سے ان سے ممیز اور منفرد ہیں کہ خالص سائنسی اصولوں پر استوار ان کی فکر میں طریقت کی چاشنی اور صوفیوں کا گداز بھی شامل ہے۔ ان کی ویب سائٹ Alamaat.com بڑی معلومات افزا اور دلچسپ ہے مگر اس سکول آف تھاٹ سے وابستہ افراد کو میڈیا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

لیکچر کے اختتام پر ہال سے باہر نکلتے لوگوں میں اکثریت اٹھارہ سے پینتیس برس کے نوجوانوں کی تھی۔ بہت سوں کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ مجھے والٹیئر کا وہ فقرہ یاد آیا "جس قوم کے نوجوانوں میں علمی ذوق پہلی ترجیح بن جائے' اسے اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

مشاہدے اور تجربے نے یہ بتایا کہ ملا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک مذہبی اور ایک غیر مذہبی۔

اللہ بخشے عبداللہ ملک زندہ ہوتے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور نہایت ادب کے ساتھ پوچھتا: ملک صاحب وہ کیا نسخہ ہے' جو نظریاتی ہونے کے باوجود آپ کو شاداں و فرماں رکھتا ہے۔ پنجابی محاورے کے مطابق' شیشے جیسا دل' جس پر عناد اور نفرت کی نمی ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ مذہبی یا غیر مذہبی' ہم نے تو صوفیوں کے سوا' جس نظریاتی آدمی کو دیکھا' ماتھے پہ شکن اور دل میں شکایت ضرور دیکھی۔

پروفیسر احمد رفیق اختر کی میرے دل میں پہلے ہی تکریم تھی اجلے' صاحب علم اور بہت کشادہ ظرف لیکن اس واقعے نے حیرت زدہ کر دیا۔ سید ابوالاعلی مودودی سے متعلق ایک بحث تھی۔ چڑچڑاپن مجھ پہ غالب آگیا اور بہت ناروا تلخی کے ساتھ میں چلایا۔ میں نے سوچا: غصہ کتنی بری چیز ہے۔ شیشے میں بال آگیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہا: اچھا بھائی' میں اپنے ذہن کو ٹٹولوں گا۔ ممکن ہے کہیں تعصب چھپا ہو' پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور یہ کہا: آپ اتنے دلچسپ آدمی ہیں کہ میرے بس میں ہوتا تو تم پر ایک کتاب لکھتا۔ نہیں' یہ صوفی کا طرز فکر ہے۔اسی طرح وہ اپنی تردید اور نفی کرتا ہے۔اس طرح وہ مسلسل غور و فکر کرتا اور زندگی کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔ اتنی بلا کی حقیقت پسندی اور پھر اس بلا کا انکسار۔ بخدا کوئی صوفیوں سے زیادہ سچا نہیں ہوتا۔ایک نئی کھڑکی کھلے تو وہ عمر بھر کے سوچے سمجھے تصورات پر نظر ثانی کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔وہ کبھی خود پہ فخر نہیں کرتے' وہ کبھی یہ آرزو نہیں پالتے کہ جنہیں وہ پسند نہیں کرتے' وہ پست اور پامال ہوں۔ امریکی پروفیسر نے کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ ''نہیں'' پروفیسر نے جواب دیا: یہ میرا دردسر نہیں۔ میرا کام تو فقط اتنا ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہوں' اسے انس اور الفت مگر دلیل کے' ساتھ بیان کر دوں۔

جی ہاں۔ بہت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ ہم سب مسلمان بادشاہوں کو مسترد نہیں کر سکتے۔ان میں سلطان صلاح الدین ایوبی تھا' جو میدان جنگ میں جب غضب عروج پر ہوتا ہے' انصاف ہی نہیں' احسان کر سکتا تھا۔ان میں بلبن تھا' جس کے قلب و دماغ میں علم اور پاکیزگی کا ایسا اکرام تھا کہ اپنی بیٹی خواجہ فرید الدین شکر گنجؒ سے بیاہ دی۔ان میں ٹیپو تھا' جس نے مغرب سے 160 برس پہلے سوشل سکیورٹی سسٹم نافذ کر دیا' حالانکہ وہ حالت جنگ میں تھا۔۔۔اور سنگ سیاہ کے مزار پر 209 برس سے چراغ جلتے ہیں اور گیت گائے جاتے ہیں۔

جی ہاں' ذوالفقار علی بھٹو کو ہم ایک مثالی حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ جمہوریت اگر محض الیکشن کا نام ہوتا' لیکن جمہوریت تو نظام عدل قائم کرنے' اداروں کو طاقتور بنانے اور اختلاف برداشت کرنے کا نام بھی ہے' پھر اس آدمی کو ہم مثالی حکمران کیسے مان لیں' جس کے عہد میں سب سے زیادہ سیاسی قتل ہوئے۔ سب سے زیادہ اخبارات بند کے گئے اور اس کے باوجود کہ وہ نہایت آسانی سے جیت جاتا' مخالف امیدوار کو اس نے اغوا کرایا اور اس کے چاروں وزراء اعلیٰ بھی بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ جس نے دستور بنانے کا سنہری کارنامہ انجام دیا اور پھر فوراً ہی دستور کا حلیہ بگاڑ دیا۔اس کے لہو سے اس کی جماعت نے زندگی اور خاندان نے اقتدار پایا لیکن تاریخ ایک بے رحم ترازو رکھتی ہے۔اس کا کوئی لاڈلا اور چہیتا نہیں ہوتا۔

جی ہاں' الا یہ کہ دلیل دی جائے' ہم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ صرف فوج ہی مارشل لاؤں کے نفاذ کی ذمہ دار ہے، سیاستدان بھی ہیں وہ طاقت کے بل پر حکومت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن کی جماعتوں میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں۔ جن میں بعض نے اربوں روپے کمائے اور بیرون ملک منتقل کر دیئے۔ جی ہاں' مسئلہ سیاسی ہے اور فوج کو اقتدار میں آنے کا ہرگز کوئی حق نہیں لیکن اخلاقی بھی۔ اگر اخلاقی اساس نہ ہو تو جمہوریت نشوونما نہیں پاتی۔اس شخص کی اخلاقی اور علمی حالت کیکر کے درخت پر جھولتے چیتھڑوں سے بھی بدتر ہے' جو شعوری تو کیا لاشعوری طور پر بھی عسکری اقتدار کا آرزومند ہو لیکن کیا صاف نظر نہیں آتا کہ چند ماہ میں فوج سیاست پر اثرانداز ہونے لگے گی۔اس لیے کہ سیاستدان وقت کو ٹھہرائے رکھنے کے آرزومند ہیں۔ ججوں کی بحالی اور صدر کی برطرفی میں وہ رکاوٹ بن گئے۔ جنرل اشفاق کیانی ایک شریف آدمی ہیں لیکن جنرل ہی ہیں' صوفی تو نہیں کہ سمندر کی سی قوت برداشت رکھتے ہوں۔

ملوکیت بدترین نظام ہے اور جنرل شاہی۔ جب انصاف عطا نہیں ہوتا تو انسان تنگ دل اور کم ظرف ہو جاتے ہیں ۔ معاشرہ غیبت کا' پھر حسد' بغض اور عناد کا شکار ہونے لگتا ہے۔ نظریات کی اہمیت اپنی جگہ لیکن نظریات نہیں معاشرے عدل میں فروغ پاتے ہیں۔ زندگی کو خدا نے تنوع میں پیدا کیا ہے اور دائم وہ ایسی ہی رہے گی۔ سیاسی جماعتیں' جمہوریت کا ایک حصہ ہیں اور الیکشن بھی۔ آزاد عدلیہ ہے' آزاد پریس ہے' طاقتور پارلیمان ہے اور مسلسل جاری رہنے والا مباحثہ۔' قوموں کے مزاج صدیوں میں بنتے ہیں اور آسانی سے بدلتے نہیں۔ خوئے غلامی ہے اور شخصیت پرستی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو دیوتا ہیں۔ابوالاعلی دیوتا ہیں' مفتی محمود' عبدالغفار خاں اور الطاف حسین بھی۔ دیوتاؤں کی نہیں، ہمیں آدمیوں کی ضرورت ہے' جو ہمارے ساتھ ہنسیں اور ہمارے ساتھ روئیں' جو بچوں کے ساتھ کھیل سکیں اور انہیں کہانی سنا سکیں۔ جن میں عظمت ہو مگر خبط عظمت نہیں۔

افغانستان ہے' جس نے بھرپور ''نظریاتی'' لیڈروں کو دیکھا لیکن جامد مذہبیت اور عدم رواداری' زخم سلنے نہ دے گی۔ سوویت یونین ہے' جس کے نظریاتی اجارہ داروں نے اسے ڈبو دیا کہ ساری کھڑکیاں انہوں نے بند کر دی تھیں۔

سرمایہ دارانہ نظام ایک عفریت ہے اور سرمایہ پرستی بدترین انداز فکر لیکن اس کا علاج نفرت پر مبنی ردعمل نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک حقیقی مطالعہ ہے۔ایک ایسے نظام کی تشکیل جو کامل آزادی کے ساتھ ایک سچا ڈسپلن بھی قائم کر دے اور سچا نظم آدمی کے اندر سے پھوٹتا ہے۔اسے کانسٹیبل نافذ نہیں کرتا۔

تاریخ کا کون سا دور ہے' جب بہترین انسانی جوہر بروئے کار آئے؟ بہترین حکمران' بہترین جنرل' بہترین منتظم' کھرے تاجر اور وہ بیدار عوام جو حکمران کے سامنے اس طرح سچ بولتے تھے گویا گھر کے صحن میں بیٹھے ہوں۔ یہ خلافت راشدہ کا عہد تھا لیکن یہاں پہنچ کر ایک سیکولر کی سانس رکنے لگتی ہے' جیسے سچی آزادی میں ایک فرقہ پرست ملا کی۔ تجربے اور مشاہدے نے یہ سکھایا: ملا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مذہبی اور سیکولر۔ ملا وہ ہے جو دل و دماغ کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ عبداللہ ملک مرحوم نے مجھ سے کہا اور سچ کہا تھا: کبھی تم ملا بن جاتے ہو۔ ''جی ہاں'' میں عرض کیا ''مگر ملک صاحب آپ بھی تو ایک طرح کے ملا ہیں۔۔۔اشتراکی ملا''۔اس پر وہ اتنا ہنسے' اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں پانی آگیا۔ عبارت تمام ہوئی۔ میرا جی اب یہ چاہتا ہے کہ ملک صاحب کی قبر پہ جاؤں اور دیر تک دعائیں پڑھتا رہوں۔ کیا چراغ سا آدمی تھا' جو جل بجھا۔ سب اسی طرح جل بجھتے ہیں' پھر زندگی کشادہ دلی کے ساتھ کیوں نہ بسر کی جائے۔ نفرت کیسی اور تنگ دلی کیا۔ آخر کو مٹی ہی میں جا ملنا ہے۔ مرنے سے پہلے ہی اپنی تھوڑی سی تردید کیوں نہ کر دی جائے' خود پہ تھوڑا سا ہنس لیا جائے۔ تھوڑا سا رو لیا جائے' تھوڑا سا جی لیا جائے۔ ورنہ نظریاتی لوگ ہیں اور فانی بدایونی

یہ تو برے آثار ہیں فانی غم ہو خوشی ہو کچھ تو ہو
یہ کیا دل کا حال ہوا، مسرور نہیں مغموم نہیں